اسلامی نظریہ تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں

پروفیسر خواجہ غلام صادق

آج کی اس تقریب سعید میں شرکت میرے لئے فلاح و بخشش کا ذریعہ ہے۔ ایسی تقاریب تواتر سے ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونی چاہئیں۔ اس طرح کی کانفرنسیں وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی طرف ایک مثبت پیش رفت ثابت ہوتی ہیں۔ احیائے دین کے تقاضے پند و نصائح یا خطبات تک ہی محدود نہیں۔ بیسویں صدی کے آخری نصف میں ذرائع ابلاغِ عامہ بہت وسیع پیمانے پر اور بڑی سہولت سے اس کرۂ ارض پر بسنے والے لوگوں کو میسّر ہیں۔ اس بنا پر مختلف تہذیبوں کا ٹکراؤ اور ان میں پایا جانے والا تضاد نوجوان اذہان کو بُری طرح متاثر کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ فلسفہ، نفسیات اور دیگر عمرانی علوم اور سائنس اور ٹکنالوجی میں بہت تیزی سے وسعت پیدا ہو رہی ہے اور ان علوم کی حاصلات بھی مذہبی تصورات پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ان سے پیدا ہونے والا CONFUSION اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مذہبی تصورات کی تشریح اس نئے پس منظر میں از سرِ نو کی جائے تاکہ احیائے دین کے علمی تقاضے پورے کئے جا سکیں۔

تبدیلی صرف علمی سطح پر ہی رُونما نہیں ہوتی۔ سماجی تبدیلی علمی تبدیلی سے کہیں زیادہ گہری اور مؤثر ہوتی ہے۔ سماجی تبدیلی میں رسم و رواج، لوگوں کے رہن سہن کے طریقے، مختلف افراد کا ایک دوسرے سے تعلق، فرد اور معاشرہ، معاشرہ اور ریاست، بین الاقوامی دباؤ PRESSURE اور

سیاسی گروہ بندیاں، ان تمام امور میں تبدیلی سماجی تبدیلی کے ذیل میں آتی ہے۔ تاریخی عمل کبھی کسی فرد یا قوم کے لیے نہیں ٹھہرتا، وہ تو ہر دم رواں دواں رہتا ہے۔ اور اسی عمل سے معاشرتی زندگی میں سماجی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹیکنالوجی کی حاصلات نے ایک عام شہری کو ایسی سہولیات سے بہرہ ور کیا ہے جو آج سے نصف صدی پہلے ترقی یافتہ ممالک میں خواص کو بھی میسر نہ تھیں۔

آج کا پڑھا لکھا نوجوان زمان و مکان کی حدود کو توڑ کر ایک بین الاقوامی معاشرے کا رکن بن گیا ہے جہاں معاشرتی رشتے اور تمدنی قدریں ہر دم نئے سانچوں میں ڈھلتی رہتی ہیں۔ اس سماجی عمل و ردِ عمل سے ایک بین الاقوامی تمدن مختلف اقوام میں مضبوط جڑیں پکڑ رہا ہے۔ اور یہ ایک عام نفسیاتی حقیقت ہے کہ ایسی صورت میں ترقی پذیر معاشرہ ترقی یافتہ معاشرے کی تقلید میں اپنی ثقافتی جڑوں سے کٹتا چلا جاتا ہے۔ اس کی اپنی پہچان مخدوش ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر معاشرہ تشخص کے بحران CRISIS OF IDENTITY کا شکار ہو جاتا ہے۔

پرانی طرزِ زندگی نئے دور کے تقاضوں کے لئے فکری بنیادیں فراہم نہیں کرتی اور اس سے عقیدے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ ضعفِ ایمان کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال سے پڑھا لکھا نوجوان دوچار ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو غور و فکر نہیں کرتے اور اپنی تنقیدی اور تخلیقی فکر کو زنگ آلود رکھتے ہیں، ان کے لئے ایسے مسائل پیدا نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی لاتے ہیں۔ ان کی زندگیاں جماداتی و نباتاتی سطحوں سے آگے نہیں بڑھتیں۔ مگر ایک زندہ و جاوید معاشرہ اپنے تاریخی اور ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھتے ہوئے نئی SYNTHESIS کو بھی اپنے اندر سموتا ہے۔ اس SYNTHESIS کی ایک علمی سطح ہے اور ایک عملی سطح

جبتک عمل کو علم پر استوار نہ کیا جائے اس وقت تک فرد اور معاشرہ مُغائرت کا شکار رہتے ہیں - اہلِ علم اور اہلِ دل کی اس محفل کے شرکا کی توجہ ایک اہم سماجی ذمّے داری کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور دینی تنظیموں کی زندگی کے بارے میں یکطرفہ پیش رفت کی پالیسی پر نظرثانی کے لیے درخواست کرنا چاہتا ہوں - میری گزارشات کا محور اسلامی نظریۂ تعلیم کے بنیادی ستون اور ہماری ذمّے داریاں ہیں -

اسلامی فکر کے بنیادی منابع قرآن اور احادیث نبوی ہیں - ان منابع سے اسلامی تاریخ میں جس طرح فائدہ اٹھایا گیا اور جس طور انہیں مسلمانوں کی مجلسی زندگی کی رُوح قرار دیا گیا، ان سے ہماری فکری تاریخ کے ثانوی منابع معرضِ وجود میں آئے - ثانوی منابع دراصل ان کوششوں کی عکاسی کرتے ہیں جو ہمارے مشاہیر، مفکّرین اور اولیا نے قرآنی تعلیمات کو اپنانے اور انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں رائج کرنے کے سلسلے میں روا رکھیں قرآنی تعلیمات کا ایک بنیادی وظیفہ کسی ایک فرد کا حقیقتِ مطلقہ سے تعلق قائم کرنے اور اسی تعلق کی روشنی میں اس کردار کی نشاندہی کرنے سے عبارت ہے جو کسی شخص نے اپنے گرد و پیش میں موجود اشیا، جمادات، نباتات، حیوانات اور دیگر افراد سے روا رکھنا ہے - باری تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے سلسلے کا آغاز خارجی دنیا میں موجود اشیا کے ساتھ ایک خاص رویے کے تحت تعلقات قائم کرنے سے ہوتا ہے اور پھر بعد میں آفاق سے اَنفس کی طرف پیش رفت ہوتی ہے - اس دوسرے مرحلے کی تین سطحیں ہیں - پہلی سطح پر اپنے آپ کو خود اپنے شعور کی روشنی میں دیکھنا ... اپنے ظاہر اور باطن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعی کا جائزہ لینا ہے ... سطح پر اپنے آپ کو دوسروں کے شعور کی روشنی میں دیکھنا ہے ... اوامر و نواہی، اخلاقی ضابطوں اور معاشی قدروں کے حوالے سے ...

کو پرکھنا ہے - اور تیسرے اور آخری مرحلے میں اپنے آپ کو خدا کی ذات کے شعور کی روشنی میں دیکھنا ہے یعنی اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ کس حد تک رضائے الٰہی کے تابع اپنے اعمال، اپنے فیصلے، اپنا اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا کر رکھا ہے - چونکہ اللہ تعالےٰ کی ذات حیّ و قیوم ہے اسلئے رضائے الٰہی کے تابع فیصلے دراصل تاریخ کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر فیصلے کرنے کے مترادف ہیں - ہم بعض فیصلے وقتی منفعت یا عارضی ہیجانی کیفیات کے دباؤ کے تحت کرتے ہیں - غصے کی حالت میں کئے گئے فیصلے اسی ضمن میں آتے ہیں یا ذاتی دلچسپی کے حصول کے لئے اخلاقی ضابطوں اور قانونی تقاضوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے کئے گئے فیصلے اسی نوع کے فیصلے ہوتے ہیں - دنیاداری کے تمام طریقے ذاتی منفعت کی کسی نہ کسی حالت کی عکاسی کرتے ہیں اور اسی کے تابع ہوتے ہیں - اخلاقی ضابطے بھی عمومی صورتِ حال کے لئے راہنمائی کرتے ہیں اور عام حالات میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے - مگر بعض اوقات انسان ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے جو یکتائی سے متصف ہوتی ہے - ایسی صورت میں اخلاقی ضابطے بھی ناکافی ثابت ہوتے ہیں - حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کا رضائے الٰہی کے لئے قربان کرنے کا حکم ایک ایسا حکم تھا جو کسی اخلاقی ضابطہ کے تحت نہیں تھا -

رضائے الٰہی کی یہ ایک ایسی صوُرت تھی جسے آنے والی تمام انسانی نسلوں کے لئے ایک روشن مثال بننا تھی - احکام الٰہی کی پابندی کی ایک اور صورت حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے لئے آتش نمرود میں ڈالا جانا تھا - حضرت اسماعیل اور بی بی ہاجرہ کو مکّہ کی بے آباد وادی میں اللہ کے بھروسے پر چھوڑنا بھی رضائے الٰہی کی تکمیل کی ایک انوکھی صورت تھی - ذاتی یا گروہی منفعت کے تصوّر سے مکمل طور پر بالا ہو کر فیصلہ کرنا، تاریخ کے کٹہرے میں

کھڑے ہو کر فیصلہ کرنے کے برابر ہے یعنی آنے والے تمام تاریخی ادوار کے شعور کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے - آدم گری کی یہ اعلیٰ ترین صورت ہے اور بہت مضبوط شخصیتوں کے مالک افراد ہی اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں - اسلامی فلسفۂ تعلیم کا بنیادی ستون آدم گری کی اسی صورت سے عبارت ہے - نبی کریم کی بارگاہ میں جن صحابہ کرام نے تربیت حاصل کی وہ سب آدم گری کے مراحل سے کامیابی سے گزرے - تعلیم کا بنیادی مقصد معاشرے میں ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو رضائے الٰہی کے تصور سے فیصلے کریں، جو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہیں - تعلیم کے باقی تمام مقاصد پر اس بات کو فوقیت حاصل ہے - صاحبِ ایمان ہونا مضبوط شخصیت کا مالک ہونا ہے مگر آدم گری کی منزل تک ہی رکنا نہیں یہ تو وہ بنیاد ہے جس پر تعلیم کی باقیماندہ عمارت تعمیر کرنا ہے -

قرآن نے آدم کو جو دوسرا فریضہ سونپا ہے اس کا تعلق تسخیرِ کائنات سے ہے - یہ شمس و قمر انسان کے لئے مسخر کئے گئے ہیں - تسخیرِ کائنات کی مہم کا آغاز اپنے جغرافیائی سماجی اور تاریخی ماحول کو پوری طرح گرفت میں لینے سے ہوتا ہے - اور اس کام کی ابتدا حصولِ علم سے ہوتی ہے - اپنے ماحول یا ENVIRONMENT پر کنٹرول، گرفت تجربی علم سے ہی ممکن ہے - تجربی علم، مشاہدے اور تجربے سے عبارت ہے - اس علم کا مقصود قانونِ قدرت کی دریافت ہے تاکہ اپنے گرد و پیش ہونے والے واقعات کے بارے پیش گوئی بھی کی جا سکے اور انہیں جب چاہیں رونما بھی کر سکیں - تجربی علم کے تحت حاصل شدہ معلومات قابلِ اعتماد ہوتی ہیں یہ اس لئے کہ قوانینِ قدرت تمام کائنات میں تواتر اور یکسانیت سے رونما ہوتے ہیں - واقعات پر کنٹرول یعنی ان کے بارے میں پیشگوئی اور انہیں مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لئے رونما کرنا یہ ٹکنالوجی کے تحت آتا ہے -

سائنس اور ٹکنالوجی میں مکمل دسترس حاصل کرنے سے ہی تسخیر کائنات کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے - ہم نے صدیوں سے قرآنی تعلیمات کے اس حصے پر عمل کرنے کا کام مغربی اقوام کو سونپ رکھا ہے -

مذہبی تعلیم کے اداروں میں قرآنی تعلیمات کے پہلے جزو پر ہی توجہ مرکوز کی جاتی ہے اور یہاں پر بھی ہماری کاوش نیم دلانہ ہے - ہماری تعلیمی درس گاہوں میں اسلامی اصولوں پر اُستوار کی گئی آدم گری کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے - مغربی اقوام نے علم کو قوّت گردانا ہے اور اسی اصول پر آج تک کاربند ہیں - اسلام نے علم کو ذمے داری ٹھہرایا ہے اور انسانی فلاح و بہبود کے حصول کو تعلیم کا مقصد قرار دیا ہے - بندے کا اللہ سے تعلق جوڑنا اور علم کو قدرت کے وسائل کا انسانی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنے کا ذریعہ تصوّر کرنا اسلامی نظریۂ تعلیم کے بنیادی ستون ہیں — قرآن کانفرنس اور ایسے دیگر اجتماعات میں ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ ہمارے ادارے کس حد تک اسلامی فلسفۂ تعلیم کے ان بنیادی ستونوں پر استوار کیے گئے ہیں -

آخری قسط

از:- پروفیسر مرزا محمد منوّر

علّامہ اقبال اور کتابِ زندہ

انسان محض مادی وجود نہیں، وہ روح و مادہ کی یکجائی کا مظہر جمیل ہے۔ لہذا اس کی بدنی اور روحانی دونوں طرح کی تربیت اور پرورش ضروری ہے۔ اگر محض ایک ہی جانب پلڑا جھکا رہے تو آدم اس میزان و اعتدال سے محروم رہ جاتا ہے جس کے بغیر وہ صحیح معنوں میں اپنی تکمیل نہیں کر سکتا۔ روح اگر مادے کی بالیوں کھینچ لے بدن کے مطالبات کی غلام عاجز ہو کر رہ جائے تو آدم کی منزل خود آگاہی اس سے ہمیشہ دور ہی رہے گی۔ خود آگاہی تو بیداری روح ہے جس کا مطلب ہے روح کا مغلوب محکوم نہ ہونا، بلکہ اس کے برعکس غالب و حاکم ہونا۔

آج کے دور کا اجتماعی مزاج مادہ پرستی ہے۔ آدم مٹی سے بنا لہذا مٹی کی کے قرب میں اسے سہولت محسوس ہوتی ہے۔ جسم کی راحت وہی مٹی کے قرب کی راحت ہے مٹی کی سطح سے روح کا اوپر کی طرف اٹھنا اور بدن کو تعاون کا عادی بنانا بڑا مشقت طلب سفر ہے۔ مقالے کے آغاز میں بالفاظ حضرت علامہ اور بحوالہ آیات الٰہی بتایا گیا ہے کہ آدم کو اوپر کی طرف جانا ہے مشقت اٹھا کے جانا ہے۔ مادے کی پستی سے روح کی بلندی تک کا سفر بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ چنانچہ جب بھی آدم کو مادی راحت کی خواب گیں کیفیت سے جگانے کی کوشش کی جائے تو وہ اسے اپنے حق میں عداوت جانتا ہے اور لڑ پڑتا ہے۔ انفرادی زندگی میں بھی اس کا رد عمل یہی ہے اور اجتماعی حیثیت میں بھی۔ لہذا ایسی تمام عادتیں اور خصلتیں جو روح کو (بلکہ ساتھ ہی بدن کو بھی) کھا جائیں ترک کر دینی چاہئیں۔ اس جانکاہ و تن فرسا کیفیت کے اساطے میں ہر بیانے مقدار

آجاتی ہے۔ مگر ناآگاہ اور ناخود شناس آدم کیسے گا۔ یہی تو زندگی ہے۔ بری زندگی کی مصلحتیں جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتیں۔ ہر وہ منفعت جو مادی راحت کے وسائل مہیا کرے وہ ٹھیک ہے۔ حتیٰ کہ خود حکومتیں انہی اجتماعی مصلحتوں کے پیشِ نظر ناجائز اور آدم کش مادی ذرائع آمدنی کی پشت پناہی کرنے لگتی ہیں۔ خواہ وہ آمدنی جوئے کی آمدنی ہو اور خواہ شراب کے کاروبار کی آمدنی ہو، خواہ سود کی کمائی یا اس کمائی پر ٹیکس ہو۔۔ وہی تضاد نری پر مبنی ہر دین کی بنیادی تعلیم غلط انفرادی اور اجتماعی رویّے سے ٹکراتی رہی ہے۔ اسلام کی وہ صورت جو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتی ہے، تمام سابقہ ادیان کی آخری ترقی یافتہ صورت ہے اور مادی مصالح کے باب میں اسلام کے رویّے کی روح حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ قول معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی بنا کے بھیجا تھا نہ کہ ٹیکس کلکٹر۔

انسان کے لیے خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ کیا اس مسئلہ خیر و شر کا فیصلہ انسان خود اپنی دانش کے سہارے کر بھی سکتا ہے؟ یہ مسئلہ یورپ والوں نے فلسفے کے کھاتے میں ڈال دیا۔ یہی کچھ قدیم فلاسفہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ فلاسفہ کے بس کا روگ نہیں۔ انسان اپنا خالق خود نہیں، وہ اپنے امکانات اور اپنی حدود سے بخوبی آگاہ ہو ہی نہیں سکتا، خالق خدا ہے اور خالق ہی اپنی مخلوق کی ہمہ نوعی حیثیت کو بخوبی جانتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "اَلاَ یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟) لہٰذا خیر اور شر کا مسئلہ احکامِ الٰہی کی روشنی میں حل ہونا چاہیئے۔ خدا کی ہدایت ہی اس باب میں معیار ہے۔ جن جن کاموں کے کرنے کا حکم ملا ہے وہ خیر ہیں اور جن جن امور سے منع کیا گیا ہے وہ شر ہیں۔ عباس محمود العقاد لکھتے ہیں۔

"مکارمِ اخلاق کی بھرپور معیاری مقیاس کا مصدر وحی سماوی ہے جو آدمی کو ارضیت سے بلند کر دیتی ہے"[1]

---

[1] حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ ۔ ص ۳۷۱

آدمی جتنا ارضیت سے قریب ہے اتنا انسانی اعتبار سے غیر ذی حیات ہے۔ قرآن بنو آدم کو مٹی سے اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ

یہ امر خدائے واحد پر ایمان و یقین کے بغیر عمل میں نہیں آسکتا۔ جب آدمی اپنے مقام کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس پر عیاں ہو جاتا ہے کہ اس کی گذرگاہ کیا ہے، مرحلے کیا ہیں اور منزل کونسی ہے، پھر اسے غیر خدا کی محبت اپنا قیدی نہیں بنا سکتی۔ وہ ہر مخلوق کی اسیری سے اور خصوصًا مادّی تقاضوں کی گرفت سے آزاد ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی کسی ملک کا مملوک نہیں ہوتا، وہ مالک ہوتا ہے، اور مالک بھی ایسا جو جانتا ہو کہ اس کے جملہ ممتلکات اللہ ہی کی امانت ہیں۔ وہ بوریا پر ہو تو جب بھی شہنشاہ ہے۔ وہ تختِ زر پر ہو جب بھی فقیر ہے، دل میں خدا بس رہا ہو تو فقیری و شاہی ہم معنی کلمات ہیں۔ خود آگاہ ہونا اور ماسوا اللہ کی محبت کا محکوم نہ ہونا عین روحِ اسلام ہے، علامہ اقبال نے کس خوبی سے شعرِ ذیل میں یہ مسئلہ بیان کر دیا ہے ؎

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

قرآنی اخلاق (اور ظاہر ہے کہ وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں) ارسطوئی اوسط کے لازمًا پابند نہیں۔ "خیر الامور اوساطہا" خود اپنی جگہ عمومی روشن اصول ہے۔ تاہم بعض شعبے ایسے ہیں جو اس اصول سے بے نیاز ہو کر باعثِ سرور و سرشاری بنتے ہیں۔ مثلًا ایثار یعنی دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا، یہ ایثار — مالی اور جانی ہر طرح کے مواقع سے تعلق رکھتا ہے، سوال یہ ہے کہ ایثار کے جذبے کا اوسط کیا ہوگا۔ حق و صداقت کی پاسداری اور خدمتِ خلق کے جذبے کی سرمستی کو لیجیے، اس کا اوسط کیا ہوگا؟ حکمِ حق کی تعمیل میں شوقِ جہاد کا اوسط کیا ہوگا؟ حیا سر بسر خیر ہے، حیا کا اوسط کیا ہوگا؟ غرض بہت سے امور ہیں جن میں حسابی اوسط کا اصول نہیں چلتا، کسی بزرگ سے کہا گیا "لاخیرَ فی الاسرافِ" (اسراف میں کوئی خیر نہیں) انہوں

نے جواب دیا: لَا سَرَفَ فِی الْخَیْرِ (خیر میں کوئی اسراف نہیں) حضرت صدیقِ اکبرؓ نے ایک جہاد کی تیاری کے موقع پر اپنا سارا اثاثہ حضور نبیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کر دیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس صدق کا اوسط لیا ہے!

گویا یوں کہنا چاہیے کہ قرآنی اسلوب توازن اور توافق کے مقتضی ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ جس مقام یا صورت حال کا تقاضا ہو وہ پورا ہونا چاہیے اور بھرپور انداز میں، مومن کی زندگی سراسر اسی قرآنی توافق و توازن کی عملی تصویر و تفسیر ہونی چاہیے۔ بقول حضرت علامہ ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

میزان اور شے ہے۔ اوسط اور چیز ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مہلت حیات کم ہے۔ کائنات کی عمر کے مقابل اس نازک وجود کی بقا تو جنبشِ مژہ کی نسبت بھی نہیں رکھتی۔ پھر تربیت اور تعلیم اور آدمیت کے اکتساب کا مطلب کیا؟ اگر حیات سچ مچ فانی ہے، آدمی مٹی کا پتلا ہے اور اسے مٹی ہی میں مل جانا ہے۔ تو پھر ان لمبے جھگڑوں میں پڑنے سے حاصل؟ زندگی آئین کی پابندی میں گذرے یا دستور کے انداز میں گذرے گذر ہی جائے گی۔

کیا حیاتِ آدم واقعی فانی و مہمل ہے؟ یہ بات وہ ہے کہ دلِ آدم میں ہر دم کھٹکتی ہے۔۔۔ اسی کے ساتھ اتنی ہی پُرخلش یہ الجھن ہے کہ آدمی مرنے کے بعد سچ مچ زندہ ہو جائے گا؟ قرآن نے بارہا تلقین کی ہے کہ بنو آدم ذمہ دار مخلوق ہیں اور انہیں اپنے اعمال خیر و شر کی جزا و سزا کے لیے بحضور خدا آنا ہے، نیز یہ کہ ہر ایک کو اپنا اپنا اعمال نامہ لے کر اس کیلئے حاضر ہونا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ زندگی اس ظاہری موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا، قرآن زندگی کے تسلسل پر روشنی ڈالتا ہے اور زندگی کا تسلسل روحانی ہے، بقول حضرت علامہ ؎

یہ مانا میں نے سمجھا ہو تن سے
کہ جاں ہوتی نہیں مرکب بدن سے !

اسی طرح حضرت ... ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

مگر انسان دوبارہ کس طرح زندہ ہوگا؟ قرآن حکیم نے مردہ زمین کی مثال سے سمجھایا ہے جو بارش کی بدولت دوبارہ جان دار بن جاتی ہے اور اس میں نمو کا جوہر پھر اپنا کمال دکھانے لگتا ہے ۔

"فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ" [1]

[illegible]

تاہم ... یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ... ریزہ ریزہ ہو جائے گا ... [illegible] ... کا جواب قرآن حکیم اس طرح دیتا ہے :

"قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ" [2]

"جو ہڈیوں کو ... ریزہ ریزہ ہو ... کو زندہ کرے گا تو اے رسولؐ کہہ دے کہ وہی جس نے پہلی بار عدم سے خلق کیا تھا ۔"

وہ خدا جس نے آدم کو خلق کیا اس عالم میں لا کر وہ کچھ : [illegible] زیادہ

---

[1] قرآن کریم، سورہ ۳۰، آیت ۵۰

[2] " " ۳۶ آیت ۷۹

اللہ آدمی کے بکھرے ہوئے ذرات کو اکٹھا نہیں کرسکتا؟ — بہرحال جو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے وہ مُردے کو بھی جلا سکتا ہے، اگر یوں دیکھیں تو قرآن — یہ کتابِ زندہ — عالمِ انسانیت کی شکستِ آرزو کا واحد علاج ہے، مٹ جانے اور ہلاک ہوجانے کا احساس بے یقینی کی پیداوار ہے، اور حق یہ ہے کہ اس احساس نے اس دور کے مادہ پرست انسان اور وجودی فلسفے کے ہزیمت آموز شعبے کے صیدِ زبوں اہلِ دانش کو زندگی کی بے معنویت کے شعورِ اذیت میں مبتلا کردیا ہے۔ زندگی کی بے معنویت کا نتیجہ فوری اور طویل المیعاد خودکشی ہے، دوسرا عیاشی، تیسرا آدم بیزاری اور آدم کشی — لب لباب یہ کہ عالمِ انسانیت احترام و مقامِ انسانیت کے شعور سے محروم ہوکر بے یقینی کی لحد میں جیتے جی داخل ہورہا ہے، مگر وہ شخص جو قرآن پر یقین رکھتا ہو وہ حضرتِ علامہ کی طرح نعرہ زن ہوگا:

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند!
آدم بمیرد از بے یقینی!

اور یہ یقین عطیہ ہے قرآن کا، تحفہ ہے اسلام کا۔